اردوافسانے کی دونمائندہ انقلابی نسائی آوازیں

(ڈاکٹر رشید جہاں اورزاہدہ حنا)

عذراپروین*

Abstract:

When we take a glimpse of the history of Urdu short story we came to know that this genre of Urdu literature became a very powerful tool of women writers who criticized the social standards of the male dominating society and produced stones revealing feminism. In this regard Dr. Rasheed Jahan of its early period and Ms. Zahida Hina of present ERA are impressive and exemplary writers. This dissertation covers the feministic approach of both these ladies who revolted against the set values of male chauvinism and demanded to recognize their identity.

اردوادب میں عورت بطورایک کردارتو اسی روز خلق ہوگئی تھی جب اس زبان میں اظہار کرنے والے کسی پہلے شاعر نے اس کے سحر کومحسوس اور دریافت کیا ہوگا۔یہی سبب ہے کہ قدیم سے قدیم ترنمونے ہوں یا جدید سے جدید تر رویے،ان میں اس کردار کو تلاش کرنا قطعی طور پرمشکل امرنہیں۔اقبال نے جب تصویر کائنات کو اسی کے رنگوں سے مزین پایا تو ایسا بےجا بھی نہیں پایا کیوں کہ اس کے وجود سے انکار گویا تخلیقی ارتقاء کے عمل کو جامد وساکت کردینے کے مترادف ہےاور شاید یہی وہ سبب تھا کہ عہد قدیم کے مرد نے اسی صفت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے دیوی جانا اور خدا کا پرتو مانتے ہوئے تعظیم کے قابل گردانا۔پھر اس پر جیسے یہ حقیقت منکشف ہوتی چلی گئی کہ وہ خود بھی اس تخلیقی عمل کا ایک لازم کردار ہےاس کی حاکمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور وہ اسے اپنے لیے پیدا کی گئی فطرت کی ان معدومی آسائشوں میں شمار کرنے لگا جس کا مقصد محض اس کے مضمحل اور تھکے ہوئے جسم وذہن کو ہشاش کرنا اور سامان تفریح پہچانا تھا۔بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد معاشرے کی تشکیل اور عورت کے متعین کردار کی تعبیر وتشریح نئی دنیا کا شاید سب سے اہم نہ سہی تاہم نہایت اہم موضوع ضرور بن گیا ہے۔نسائی ادب کی بنیاد پڑی اور تانیثیت

* شعبۂ اُردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

با قاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کلاسیکی ادب اور بالخصوص افسانوی ادب بھی زندگی کے ہر نئے زاویئے یا شعور کی مانند کسی اجتماعی حاکمیت کے لاشعوری تصور کے مرہون منت مرد ہی کے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنتا رہا ہے۔لیکن پھر رفتہ رفتہ ان کہانیوں میں سانس لیتی عورت نے محسوس کیا کہ اس کے محسوسات اور خواہشات کو شاید صحیح طور پر نہیں جانا جا رہا۔وہ جو ہے وہ دکھائی نہیں دے رہی اور جو دکھائی جا رہی ہے ویسی وہ ہے نہیں۔شعور ذات کے اسی احساس نے اسے خود اپنی کہانی لکھنے پر اکسایا تو تب اس نے محسوس کیا کہ شاید یہی وہ دنیا ہے جہاں نہ صرف وہ من چاہی زندگی جی سکتی ہے بلکہ اپنے دکھوں،سکھوں،کمزوریوں،محرمیوں اور کامیابی و کامرانیوں کا اظہار بھی کر سکتی ہے۔ایسا اظہار جو خود اس کے محسوسات سے پھوٹے اور اس کی صحیح ترجمانی کر سکے۔یوں اردو زبان میں افسانوی نثر کا وہ سفر جو ڈپٹی نذیر احمد،رتن ناتھ سرشار،عبدالحلیم شرر یا ہادی رسوا سے شروع ہوا تھا بیسویں صدی کے آغاز میں جب خواتین کے افسانوی مزاج کا حصہ بنا تو انہوں نے رومان میں ڈوبے اپنے خانگی وجذباتی تجربات کو اس کا موضوع بنایا اور یوں وہ کہانی وجود میں آئی جو بلحاظ ہئیت تو اپنی روایت سے منسوب اور اسی کی تقلید کرتی دکھائی دیتی تھی تاہم بلحاظ فکر اس میں عورت کے بلا واسطہ محسوسات کو دخل ہوا اور مشاہدہ تجربے کی کسوٹی پر اپنی حقیقی شکل میں سامنے آیا۔فنی اعتبار سے اگر چہ یہ کہانیاں کمزور تھیں تاہم عورت کے براہ راست شعور کا یہ پہلا اظہار تھا جو اپنے آغاز کے سبب خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔اس حوالے سے ۱۹۰۳ء میں اتر پردیش کے روشن خیال اور وسیع القلب عالم میر نذر الباقر کی بہن اکبری بیگم نے جس قصہ نگاری کا آغاز عباسی مرتضیٰ کے فرضی نام سے کیا وہ اس اصلاحی رنگ سے منفرد اور جداگانہ تھا۔جس میں گھر کی چار دیواری سے باہر عورت کا نام تک لینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔اکبری بیگم نے گودڑ کا لعل میں اپنی ہیروئن ثریا جبیں کا جو روپ دکھایا ہے وہ نہایت آزادانہ اور بے تکلف تھا۔اس حوالے سے میر نذر الباقر کی بیٹی اور روشن خیال اکبری بیگم کی بھتیجی نذر سجاد حیدر بھی خواتین تخلیق کاروں کی صف میں ایک نیا اور اہم اضافہ ثابت ہوئیں۔کیونکہ مس نذر الباقر کے نام سے لکھنے والی اس نوجوان لڑکی کی آزاد خیالی پر بھی کئی چوٹیں کی گئیں مگر ان کے عزم و استقلال میں کمی نہ آنے پائی۔

رفتہ رفتہ خواتین کے لیے کئی رسالے ''عصمت''(راشد الخیری،دہلی)''شریف بی بی''(منشی محبوب عالم،لاہور)ہفتہ وار''سہیلی''،''بنات''(راشد الخیری)''پردہ نشین''(بیگم احتشام،۱۹۱۲ء)اور''امہات''(قمر النساء بیگم،۱۹۳۰ء)بھی یکے بعد دیگرے جاری ہوئے۔ان رسائل میں چھپنے والے قصوں کی نوعیت بھی ابتدائی اصلاحی قصوں سے اب کسی قدر مختلف تھی۔نذر سجاد حیدر کے قصوں کی رومانوی لہر کی گونج مسز عبدالقادر کے رومانوی اور فطرت سے محبت کرنے والے مزاج میں سنائی دی اور اردو قصہ نگاری میں ایک نئے رجحان نے جنم لیا۔بعد ازاں ان کہانیوں میں موجود اس نئے رومانوی طلسماتی،تخیلاتی خوف ناک اور دہشت ناک رجحان نے حجاب امتیاز علی کے

یہاں ایک توانا اور مستقل رویے کی صورت اختیار کر لی۔ سیاسی و تاریخی اعتبار سے بھی یہ وہ عہد تھا جب سرزمین برصغیر کو آئے روز تبدیلی کا سامنا تھا۔ جبر سے نجات اور فرد کی آزادی کے نظریات پوری دنیا اور بالخصوص برصغیر میں رواج پا رہے تھے۔ لہٰذا اسی دور میں سجاد ظہیر کی رومانوی فکر کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی یا ترقی پسندی کی باغیانہ آواز بھی اردو افسانے کا موضوع بنی، جس کا ابتدائی نشان ''انگارے'' (دسمبر ۱۹۳۲ء) کے روپ میں سامنے آیا۔ دس کہانیوں کے اس مجموعے میں سجاد ظہیر، احمد علی اور بیگم رشید جہاں کی کہانیوں نے معاشرتی، اخلاقی، سماجی، مذہبی اور سیاسی کھوکھلے پن کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اگرچہ یہاں بھی جس کہانی کار کو سب سے زیادہ مزاحمت و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ بیگم رشید جہاں تھیں۔ انہیں قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں، مگر روشن خیال شیخ عبداللہ کی بے باک اور نڈر بیٹی نے کسی مصلحت کے آگے سر نہ جھکایا بلکہ سماج کے نام نہاد مصلحین کے سروں پر ان کا قلم خطرے کی تلوار بن کر لٹکتا رہا۔ بیگم رشید جہاں کی کہانیوں نے عورت کو بے باکی سکھائی، ہوش حواس کے ساتھ اپنے متعلق سوچنا سکھایا اور مرد کے دامِ فریب کا پردہ چاک کیا۔ رشید جہاں کی کہانیوں میں عورت آزادی کی ملتجی نہیں بلکہ اسے اپنا حق تصور کرتی ہے۔

۲۵ اگست ۱۹۰۵ء (دہلی) میں روشن خیال شیخ عبداللہ کے گھر پیدا ہونے والی رشید جہاں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اٹھارہ برس کی عمر میں (I.T) کالج کے میگزین میں سلمٰی کے نام سے لکھی جانے والی تحریر سے کیا۔ مسلم معاشرت کی عکاسی سے بھرپور یہ کہانی کالج کے میگزین میں انگریزی زبان میں "When the tom beats" کے نام سے شائع ہوئی۔(۱) مسلم گرلز علی گڑھ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والی رشید جہاں نے ۱۹۲۹ء میں لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج دہلی میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ ڈاکٹر رشید جہاں کشمیری نسل کی پروردہ تھیں۔ گھریلو ماحول ہی انہیں ایسا ملا جو وسیع القلبی اور وسعت ذہنی کا حسین امتزاج تھا۔ ان کے والد شیخ عبداللہ تعلیم نسواں کے بہت بڑے داعی تھے۔ شعبہ نسواں کے لیے جس خلوص سے تعلیم و تربیت کا انہوں نے انتظام و انصرام کیا اس کے نتیجے میں انہیں ''خان بہادر'' کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔(۲) رشید جہاں کی تربیت میں معاشرے کی فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کا عنصر بھی ان کے باپ کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ بقول شاہد نقوی

> ''ایک ایسی ہنگامہ خیز شخصیت جسے شعلہء جوالہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جس کی بے باکی، بے خوفی، دلیری اور حقیقت بیانی کا ایک زمانہ معترف رہا، جس نے ایک پورے عہد کو اپنی کرشمہ ساز شخصیت سے بھرپور طور پر متاثر کیا اور جس نے افسانوی ادب میں نئی روایت کی طرحیں ڈالیں جو ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک تھیں، جس نے نظریے سے وفاداری اور وابستگی میں اپنا تن من دھن سب کچھ لُٹا کر ایک مثالیہ قائم کیا۔''(۳)

ڈاکٹر رشید جہاں کو جب سجاد ظہیر اور محمود الظفر جیسے انقلاب پسند لوگوں کی صحبت میسر آئی تو انہوں نے اُن

کے ساتھ اشتراکیت کی طرف عزم و استقلال کے ساتھ قدم بڑھائے۔۱۹۳۶ء میں لکھنؤ کے نظامی پریس سے انقلاب پسند نوجوانوں کے افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' میں رشید جہاں کی ایک کہانی ''دلی کی سیر'' اور ایک ڈرامہ ''پردے کے پیچھے'' بھی شامل تھے۔''دلی کی سیر'' رشید جہاں کی ایک مختصر کہانی ہے۔جس کا مرکزی کردار عورت ہے۔کہانی میں مرد کی خودغرضی اور بے حسی نیز اُس کے حکمرانی مزاج کی بڑی عمدہ جھلکیاں ملتی ہیں جبکہ مسلم گھرانے (معمولی گھرانے) کی برقعہ پوش خاتون کے خوف اوراحساس برتری کے ڈانڈے بھی آپس میں کہیں کہیں ملتے دکھائی دیتے ہیں۔''دلی کی سیر'' اپنی نوعیت کے اعتبار سے سادہ اورمختصر کہانی ہے۔جس میں جنس نگاری کا شائبہ تک نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ مرکزی نسوانی کردار برقعہ کے سوراخوں کی اوٹ سے دنیا کو اپنی نگاہوں سے آزادانہ دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔لیکن اس زمانے میں اس کا یہی جرم بھی اسے معتوب قرار دینے کے لیے کافی ثابت ہوتا ہے۔اسی کا نتیجہ تھا کہ کہانی کار (ڈاکٹر رشید جہاں) کومردانہ سماج کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا،حتٰی کہ انہیں قتل تک کی دھمکیاں بھی موصول ہوئیں۔تاہم بیگم رشید جہاں ان دھمکیوں سے قطعاً خوف زدہ نہ ہوئیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مارکسی نظریات میں مزید شدت پیدا ہوتی گئی۔

بیگم رشید جہاں کی کہانیوں کا مجموعہ ''عورت ودیگر افسانے'' کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا جس میں نو کہانیاں اور ایک ڈرامہ شامل تھا۔اس میں بھی انہوں نے ایک پڑھی لکھی اور سیاسی وسماجی شعور کی حامل خاتون کی حیثیت سے مردانہ سماج میں اپنی بقاء کی جنگ لڑتی عورت کی مظلومیت اور بے بسی کو خالصتاً نسائی نقطہ نظر سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ان افسانوں میں موضوع،کردار وزبان کی رنگا رنگی،تنوع،سنجیدگی، گہرائی اور گیرائی کے خوب صورت اور دلچسپ نمونے ملتے ہیں۔تخیل وتفکر سے کام لیتے ہوئے انہوں نے اپنی کہانیوں میں انسانی زندگی کے مختلف روپ بھی دکھائے ہیں۔جہاں کبھی طبقاتی کشمکش ہے تو کبھی بدلتے ہوئے اور بے نام ہوتے رشتے ہیں۔معاشی وطبقاتی کشمکش کو ان کے افسانوں ''غریبوں کا بھگوان'' اور ''پُن'' میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

> ''وہ جانتی تھی کہ برہمن اس سے بہت اونچے ہیں ان کی سیوا دھرم ہے اور ان سے نفرت کرنا پاپ ہے لیکن اپنے سے مجبور تھی جب کوئی برہمن جنئو اور دھوتی میں بغیر کرتے میں نظر آتا۔تو اسے ایسا لگتا کہ وہ اس کے گھر کو کھا کر کسی دوسرے گھر کو خالی کرنے جارہے ہیں۔''(۴)

اسی طرح افسانہ ''پُن'' میں بھی وہ سماج کے مقتدر طبقے کی فیاضی کو کچھ اس طرح حدفِ تنقید بناتی نظر آتی ہیں۔

> ''دس پندرہ کے گروہ میں ایک پیسا گرتا اور وہ سب کے سب اسے لوٹنے کو زمین کی طرف لپکتے۔ایک پیسہ پر گالی گلوچ،ہاتھا پائی اور مکا بازی تک ہو جاتی! وہ پُن کی دیویاں ایک اندازِ برتری سے پیسے پھینکتی اپنے کپڑے بچاتی نکل جاتی تھیں،اور مڑ کر

بھی نہ دیکھتیں کہ ان کی اس نیکی کا انجام کیا ہوا۔''(۵)

ڈاکٹر رشید جہاں اپنے افسانوں میں عورت کی نفسیات، احساسات و جذبات اور مسائل کو بڑی باریک بینی سے پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ مرد کی ہوس پرست اور خودغرض فطرت، عورت کی مظلومیت، عدم اعتماد، بے بسی و بے کسی کے ساتھ ان کی توہم پرستی، معاشرتی فرسودگی اور جہالت پر بھی وہ غیر جانب داری سے قلم اٹھاتی ہیں۔ ان کے افسانے استخارہ اور افطاری اسی توہم پرستی کی مذمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مذہبی تنگ نظری کو وہ اپنے افسانہ ''افطاری'' میں بخوبی بے نقاب کرتی ہیں۔

> ''اس محلّہ میں زیادہ تر مسلمان آباد تھے علاوہ گھروں کے یہاں تین مسجدیں تھیں ان مسجدوں کے ملاؤں میں ایک قسم کی بازی لگی رہتی تھی کہ کون ان جاہل غریبوں کو زیادہ اُلو بنائے اور کون ان کی گاڑھی کمائی میں سے زیادہ ہضم کرے۔''(۶)

ایسے باغیانہ اور انقلابی خیالات کی حامل بیگم رشید جہاں کو مردانہ جارحیت کے حامل سماج میں کیوں کر قتل کی دھمکیاں نہ ملتیں کہ جہاں مردوں کے سب افعال و اعمال کو قبول کرنا اور صبر و شکر کا اظہار کرنا ہی شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کا وتیرہ سمجھا جاتا تھا۔ بقول ڈاکٹر حمیرا اشفاق

> ''رشید جہاں، ترقی پسند تحریک کی روح رواں تھیں ان کے فکری سوتے انسان دوستی سے پھوٹتے ہیں۔ انہوں نے قلم سے بھی وہی کام لیا جو ایک ڈاکٹر دوا سے لیتا ہے۔ انہوں نے اپنے بعد لکھنے والی خواتین کے لیے ہمت سے سچ کا ساتھ دینے کی مثال قائم کر دی۔''(۷)

اگرچہ بیگم رشید جہاں کی کہانیوں میں کرداروں کا انبار ہے تاہم یہ کردار ہر طبقے، ہر گروہ، ہر نسل کے حامل افراد کے مزاج و مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تاہم عورتوں کے کردار ان کی کہانیوں میں زیادہ تعداد میں ہیں اور مرکزی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں مرکزی اہمیت ہیرو کے بجائے ہیروئن کو حاصل ہے۔ ہوسکتا ہے زبان و بیان اور اسلوب کے باب میں بیگم رشید جہاں کوئی نمایاں کارنامہ سرانجام نہ دے سکیں ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے باغیانہ خیالات میں شدت کی بدولت افسانے کی نزاکتوں کو بھی مکمل طور پر قائم نہ رکھ سکی ہوں تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے مردانہ سماج میں عورتوں کی جرات و بے باکی کو ایک قابلِ تقلید رجحان دیا۔ جس کی اولین صورت اگر وہ خود تھیں تو مکمل ارتقائی صورت زاہدہ حنا میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو ہندوستان کے صوبہ بہار کے تاریخی شہر ''سہسرام'' میں پیدا ہونے والی زاہدہ حنا نے ''فردوسِ گم گشتہ'' کے عنوان سے اپنا پہلا افسانہ ۱۹۶۲ء میں لکھا جو ۱۹۶۳ء میں ''ہم قلم'' کراچی میں شائع ہوا۔(۸) ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''قیدی سانس لیتا ہے'' جبکہ دوسرا افسانوی مجموعہ ''راہ میں اجل ہے'' کے نام سے اردو ادب کے افسانوی منظرنامے کا حصہ بنا۔ زاہدہ حنا کے والد ''ابوالخیر کشفی آدرشی آدمی تھے۔ وہ بغاوت اور شورش کے

جرم کی پاداش میں قیدی بھی ہوئے۔اوئل عمری ہی میں زاہدہ حنا کے والد نے انہیں اردو اور فارسی ادب کی طرف راغب کیا۔(۹) زاہدہ حنا عہدِ جدید کی ایک ایسی باشعور افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے عہد کے متضاد رویوں، انسانیت کُش اعمال وافعال اور انسانی فکر کی آزادی کو سلب کرنے والے مکروہ ہتھکنڈوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے امن و آشتی کا علم بلند کیا ہے ان کے افسانوں کی دنیا متنوع موضوعات سے تشکیل پذیر ہوتی ہے۔عصری شعور کی حامل یہ کہانی کار اپنی کہانیوں میں عصری حقائق ومسائل کا بڑی غیر جانب داری کے ساتھ تجزیہ کرتی ہیں۔مصلحت پسندی نے ان کے قلم کو کبھی زنگ آلود نہیں ہونے دیا۔سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی دردمندی رقت آمیزی میں بدل کر قلم کو جذباتیت کا شکار نہیں ہونے دیتی۔

ہجرت سے پیدا شدہ مسائل بھی ان کا خاص موضوع رہے ہیں۔ادھ کھلی آنکھ سے آزادی، انسانیت و مساوات کا خواب، ہجرت کے بعد جس طرح ٹوٹا، حرص وہوس، طمع ولالچ اور زر پرستی کے رجحانات نے فروغ پا کر انسانی رشتوں کے تقدس کو جس طرح پامال کیا نیز لوٹ کھسوٹ اور ظلم و بربریت واستحصالی رویے نے مقتدر اور مراعات یافتہ طبقے کو جس طرح مزید طاقتور اور کمزور کو کمزور تر کر دیا، اور معاشرے کو کھوکھلے پن کا شکار کر دیا، کو زاہدہ حنا نے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا جبکہ دوسری طرف حساس لوگوں نے اپنے خاندان، گھر، روایات اور تہذیبی جڑوں کو چھوڑ کر از سرِ نو اجنبی سرزمینوں اور ماحول کو اپنایا اور یہ سانحہ جس طرح ان کی شخصیت دولخت کر گیا کہ وہ اپنی چھوڑی ہوئی قیمتی متاع کو کبھی بھی بھلا نہ سکے اور ان کے یہاں ناسٹلجک رویے نے فروغ پایا، کو بھی انہوں نے اپنا موضوع بنایا۔عوامی فلاح و بہبود، انسان دوستی اور امن وآزادی کے خوابوں کی اس شکست وریخت کو ان کے افسانے ''آخری بوند کی خوشبو'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔جس کا ''سائیں بخش'' (سندھی کردار) اپنی آدرش پرستی کے بعد عمر گزار کر جب اس امید کے ساتھ گھر لوٹتا ہے کہ اب اس کا قبیلہ آزادی سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا تو اس کو منہ کی کھانا پڑتی ہے۔انگریزوں کی غلامی قبول نہ کرنے اور اپنے ماضی کی عظمت کی بحالی کے خواب دیکھنے والے سائیں اللہ بخش کی یادیں پورے افسانے میں اداسی کی لہر پیدا کرتی ہیں کہ ملازمت تک میں انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے والے سائیں اللہ بخش کو اپنے خوابوں اور آزادی کی خواہش کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

> ''۔۔۔۔۔اور پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ نفرتوں نے شاخِ دل پر آشیاں بنا لیا۔زمینیں آباد ہوگئیں اور دل برباد ہوگئے۔''(۱۰)

افسانہ ''معدوم ابنِ معدوم'' بھی زاہدہ حنا کا اس حوالے سے اہم افسانہ ہے کہ اس میں ہجرت کو بدلتے وقت کے تناظر میں دیکھنے کی کاوش کی گئی ہے۔کرنل معصوم حسین کو اپنی مٹی (سرزمین) سے وفا آباؤ اجداد کی یادگاروں کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرنے اور آبائی قبروں سے دور نہ جانے کے عہد کو نبھانے کے عوض بہت سی قربانیاں دینا پڑتی ہیں، دوستوں، عزیزوں کو بے بسی سے سرحد پار جاتا دیکھنے والے کرنل معصوم حسین کو اپنے اکلوتے بیٹے جعفر

حسین کی جدائی کا دکھ بھی سہنا پڑتا ہے کہ جو پاکستان جا کر وہاں اپنی پھوپھی زاد سے شادی کر لیتا ہے اور ماں باپ سے منہ موڑ لیتا ہے۔

> ''ہر رات سونے سے پہلے یہ خیال انہیں ستاتا تھا کہ ان کے کسی حریف نے نہیں، خود
> ان کے اپنے خون نے انہیں شکست دی تھی۔''(۱۱)

لیکن افسوس پھر بھی ہر دو طرف انہیں اور ان کی آئندہ نسل کو شکوک و شبہات کا سامنا کرنا پڑتا ہے یعنی سر زمین ہند پر کرنل معصوم حسین کی وفاداری پر شک کیا جاتا ہے تو پاکستان میں کرنل معصوم حسین کے اکلوتے پوتے علی اکبر کو اپنے ملک (پاکستان) میں پولیس دہشت گردی کی نذر ہونا پڑتا ہے جس پر کرنل معصوم حسین کو بھی اپنا شجرہ بھی معدوم ہوتا نظر آنے لگتا ہے اور وہ جاننے لگتے ہیں کہ:

> ''گھروں کو چاٹنے کے بعد نسلوں کو چاٹ جانے کا مرحلہ آن پہنچا تھا۔''(۱۲)

زاہدہ حنا کی کہانیوں سے ہی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ صدیوں پرانے جنگلوں میں رہنے والے وحشی انسان نے ترقی یافتہ اور مہذب ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود بھی وحشی رسومات اور اپنے آباؤ اجداد کے ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے پرانے ہتھکنڈوں سے نجات حاصل نہیں کی بس اکیسویں صدی میں اس کا طریقہ کار بدل گیا ہے۔ انہوں نے عہد جدید میں ظلم و ستم اور جبر و تشدد کے انہی ٹارچر سیلوں، بندی خانوں، اذیت گاہوں اور عقوبت خانوں کی بھیانک فضا کو اپنے افسانوں ''رنگ تمام خوں شد''، ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ''جسم و زباں کی موت سے پہلے'' اور ''آخری بوند'' وغیرہ میں موضوع بنایا ہے۔ زاہدہ حنا کا مسلک صلح کل ہے ان کی محبت، ہمدردی اور خلوص کسی ایک طبقے یا علاقہ و برادری تک محدود نہیں بلکہ وہ دنیا اور زوال پذیر معاشروں میں مذہبی و ثقافتی اقلیتوں پر گذرنے والی بیدادگری کی داستانوں کو رنگ و نسل کی تخصیص کے بغیر نوکِ قلم پر لاتی ہیں۔ اپنے افسانہ ''بہ ہر سو رقص بسمل بود'' میں وہ بہاریوں، احمدیوں، ذکریوں عیسائیوں، سکھوں اور ہندوؤں وغیرہ کے حوالے سے ماضی و حال میں بپا ظلم و بربریت اور جرم و جفا کا سلسلہ کربلا کی سرزمین پر مظلومین کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم اور جبر و تشدد کے ساتھ جا ملاتی ہیں۔ ان کے کردار ہجرت و مسافرت کے ساتھ ساتھ ذہنی و جسمانی جلاوطنی کا کرب اپنے اندر سمیٹتے اور نتیجتاً توڑ پھوڑ کا شکار ہوتے نظر آتے ہیں اس کہانی میں ایک طرف تو خانم خجستہ کی جلاوطنی کی ازلی داستان (اقلیتوں پر روا ظلم) کو دوہرایا گیا ہے جب کہ دوسری طرف آزادیٔ فکر اور حریت کے پاسداروں یا بات کرنے والوں کو دردناک انجام سے دوچار ہوتے دکھایا گیا ہے جس کی نمائندگی دو بہن بھائی ناہید نجف (دیارِ غیر میں جنوبی ایشیا کی مذہبی اقلیتوں پر ہونے والے ظلم پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے والی پاکستانی) اور نجیب (تاریک جیلوں اور عقوبت خانوں میں ہونے والے ظلم و ستم کی داستان کو منظر عام پر لانے کی خواہش کرنے والا کیمرہ مین، صحافی) کے ذریعے کی گئی ہے۔

> ''اماں نے ٹھنڈا سانس لے کر اپنی دونوں اولادوں کو دیکھا جنہیں کتابوں نے کہیں کا
> نہیں رکھا تھا۔ یہ اچھا تھا کہ ناہید باہر چلی گئی تھی لیکن وہ جب سے واپس آئی تھی، ان کی

جان سولی پر تھی۔۔۔۔ایک ہی بیٹا تھا اور انہوں نے اس کے باہر چلے جانے کی بھی کیسی کیسی دعائیں نہیں کی تھیں، منتیں نہیں مانگی تھیں۔'' (۱۳)

اُن کا افسانہ'' یکے بود، یکے نہ بود'' بھی مذہبی اقلیتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی، نفرت اور اس سے جنم لینے والے اقلیتی کرب کو اپنے اندر سموئے'' شاہ پور'' کی داستان ہے کہ جو'' کمہارواڑے'' سے'' آرٹ ڈویژن آف امریکن سرامک سوسائٹی'' تک جا پہنچتا ہے لیکن اس کی مٹی کی بنائی ہوئی آرائشی اشیا اور ٹائلیں سیرا کیور میوزیم کی سالانہ رو بینو یادگاری نمائش میں انعام حاصل کرنے کے باوجود بھی اپنی معتوب و مقہور اقلیت (بہائی اقلیت) کی در بدری اور تذلیل کے دکھ کو ختم نہیں کر پاتیں اور وہ اس نتیجے پر جا پہنچتا ہے کہ۔

''۔۔۔۔جن اقلیتوں پر زندگی مہربان نہ ہو وہ ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر اختیار کرتی رہتی ہیں۔'' (۱۴)

زاہدہ حنا کا تاریخی شعور ان کے افسانہ'' رقصِ مقابر'' میں اپنے جوہر دکھاتا ہے۔جس میں افغانستان کے ماضی و حال، طالبان کا ظلم و ستم اور'' شہنشاہ بابر'' کا تاریخی کردار قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔زاہدہ حنا کے افسانوی موضوعات کے حوالے سے مرزا حامد بیگ کا خیال ہے کہ آج کی باشعور عورت جو پڑھی لکھی بھی ہے اسے وصل میں انجماد اور فراق میں اضطراب و تحرک کا احساس ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا چناؤ فراق ہے وصال نہیں۔ (۱۵)

دراصل زاہدہ حنا کے افسانوں کی عورت بلوغت کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔اب وہ محض جہیز میں قرآن شریف کے ساتھ ملنے والے'' بہشتی زیور'' کی تعلیمات پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کرتی بلکہ عورت کی تذلیل، اسیری اور خوشنودی کے باہمی تعلق کو شک و شبہے کی نگاہ سے بھی دیکھتی ہے۔زاہدہ حنا دنیاوی اذیت کو برداشت کرنے کے بعد (اور مرد کی غلامی کر کے) صلے میں ملنے والی آخرت کی بھلائی اور سرخروئی کی امید کو بھی تنقید کا نشانہ بناتی ہیں۔افسانہ'' زمین آگ کی آسمان آگ کا'' میں انتہائی موثر پیرائے میں لکھتی کرتی ہیں کہ

''خاک پڑھا اور سمجھا ہے تم نے اس مسئلے مسائل کو، مولانا حضرت اشرف علی تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں جہاں تک ممکن ہو سکے۔میاں کا دل ہاتھ میں لیے رہو اور اس کی آنکھ کے اشارے پر چلا کرو۔اگر وہ کہے کہ رات بھر ہاتھ باندھے کھڑی رہو تو دنیا و آخرت کی بھلائی اسی میں ہے کہ دنیا کی تھوڑی سی تکلیف گوارا کرے۔آخرت کی بھلائی اور سرخروئی حاصل کرو۔'' (۱۶)

افسوس تو یہ ہے کہ یہ کہانی پڑھی لکھی عورت اور جاہل وان پڑھ مرد کی عدم ذہنی مطابقت کے المیے سے جنم نہیں لیتی بلکہ اس پڑھی لکھی عورت'' شہنشاہ بانو'' کا مرد'' دلاور'' خود بھی ایک پڑھا لکھا شخص ہے، لیکن باوجود اس کے بیوی کی ادب سے وابستگی کو قابلِ نفرین سمجھتا ہے۔شوکتِ پندار وانا کا بھرم رکھنے اور جرات و بیباکی سے باطل قوتوں

کے سامنے کبھی نہ جھکنے کی ایک اور صورت ان کے افسانہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی'' میں بھی ملتی ہے کہ جس میں جرم و سزا، جبر و تشدد اور فوجی حراست کا شکار ہونے والی نرجس، جور و ستم، فوجی جبر و استبداد سے بچنے کی خاطر ضمیر کی مجرم بننے کے لیے خود کو تیار نہیں کر پاتی۔

> ''وارڈن مریم نے ماں اور بیٹے پر ایک نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ یہ کیسی عورت تھی جس نے موت کی سزا کے خلاف رحم کی اپیل نہیں کی تھی، جس نے پھانسی گھر پہنچ کر ایک آنسو نہیں بہایا تھا، چیخیں نہیں ماری تھیں۔ خدا سے لیکر جیلر تک کسی کو بھی گالیاں نہیں دی تھیں۔'' (۱۷)

ڈاکٹر سلطانہ بخش زاہدہ حنا کے موضوعات کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

> ''زاہدہ حنا کے افسانوں کا بنیادی مزاج قوت، حسن اور صداقت ہے۔ دنیا کی ہر بد صورتی کے خلاف ایک ردعمل، ایک چیلنج ہے، خواہ وہ بدصورتی سماجی سطح پر ہو، سیاسی یا معاشی نوعیت کی ہو یا کوئی اور ان کے ہاں تاریخ اور اساطیر کا شوق، مطالعہ اور اس کا گہرا ادراک نظر آتا ہے۔'' (۱۸)

اردو افسانے کی ان دو معتبر نسائی آوازوں کے اجمالی جائزے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں محض خانگی نوعیت کے مسائل کا ادراک ہی نہیں بلکہ گہرا سماجی شعور بھی موجود ہے۔ مزید برآں پدرسری معاشرے کے اندر عورت کا احساس ذات اور اپنے وجود کی شناخت کے حوالے سے کی جانے والی مزاحمت اپنی جگہ قابل تحسین ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاہدہ بانو، ڈاکٹر ''ڈاکٹر رشید جہاں۔ حیات اور کارنامے'' نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ، ص ۶۸

۲۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ''ملاحظات از بیادِ رشید جہاں'' مشمولہ نگار پاکستان، کراچی، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۰۴ء، ص ۲

۳۔ شاہد نقوی، ''بیدار شعاعیں'' ارتقاء پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص ۷۰

۴۔ حمیرا اشفاق (مرتب)، ''نثر رشید جہاں''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۱

۵۔ ایضاً ص ۱۰۷

۶۔ ایضاً ص ۲۶

۷۔ ایضاً ص ۲۱

۸۔ زاہدہ حنا، ''دل کا کیا رنگ کروں''، مشمولہ دنیا زاد، کراچی، کتابی سلسلہ نمبر ۱۲، جولائی ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۰

۹۔ دردانہ جاوید، ''پاکستان کی منتخب افسانہ نگار خواتین''، قصر الادب، حیدرآباد، ۲۰۰۲ء، ص ۹۰

۱۰۔ زاہدہ حنا، ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۶

۱۱۔ زاہدہ حنا، ''رقصِ بسمل ہے''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۳۸
۱۲۔ ایضاً ص ۴۹
۱۳۔ ایضاً ص ۹۸
۱۴۔ زاہدہ حنا، ''راہ میں اجل ہے''، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۶ء، طبع سوم، ص ۱۹۵
۱۵۔ حامد بیگ، مرزا، ''نسوانی آوازیں''، سارنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۸۷
۱۶۔ زاہدہ حنا، ''راہ میں اجل ہے''، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۶ء، طبع سوم، ص ۱۸۳
۱۷۔ زاہدہ حنا، ''رقصِ بسمل ہے''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۸
۱۸۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، ''پاکستانی اہل قلم خواتین ایک ادبی جائزہ''، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۹